آج

۵۵

جلال آلِ احمد

رام کمار

اورحان پامک

ترتیب

اجمل کمال

rekhta

BROUGHT TO YOU BY

عالمی کتابوں کے اردو تراجم PDF
فیس بک گروپ

www.facebook.com/groups/akkut

اورحان پامک

ترکی سے ترجمہ: نمیرہ احمد، اجمل کمال

ابا کا سوٹ کیس

وفات سے دو سال پہلے میرے ابا نے اپنی تحریروں، مسودوں اور ڈائریوں سے بھرا ایک چھوٹا سوٹ کیس میرے سپرد کیا۔ ہمیشہ کی طرح بذلہ سنج، پُر مذاق انداز اختیار کرتے ہوئے، انھوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں یہ چیزیں ان کے جانے کے بعد، یعنی ان کی موت کے بعد پڑھوں۔

تھوڑا سا جھجکتے ہوئے بولے، ''انھیں ایک بار دیکھ لینا۔ اگر کچھ کام کی چیزیں ہوں تو انھیں چن کر چھپوا دینا۔''

ہم دونوں میری مطالعہ گاہ میں، کتابوں کے درمیان تھے۔ کسی ایسے شخص کی طرح جو کسی تکلیف دہ اور بہت خاص بوجھ سے چھٹکارا پانا چاہتا ہو، وہ کمرے میں چکر لگا کر کوئی ایسی جگہ ڈھونڈ رہے تھے جہاں اس سوٹ کیس کو رکھ سکیں۔ آخرکار انھوں نے اسے آہستگی سے ایک ایسے کونے میں رکھ دیا جس پر کسی کی سیدھے نظر نہیں پڑتی تھی۔ یہ لمحہ، جو ہم دونوں کے لیے ایک شرمندہ کرنے والا اور ناقابلِ فراموش لمحہ تھا، جوں ہی گزرا ہم دونوں اپنے معمول کے کرداروں میں واپس آ گئے، زندگی کو سبک انداز سے لیتے ہوئے، ہماری شرارتی، پُر مذاق شخصیتیں (personas) دوبارہ ابھر آئیں اور ہم پرسکون ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح ہم نے ہوا پانی، روزمرہ کی زندگی، ترکی کے کبھی نہ ختم ہونے والے سیاسی مسئلوں، اور ابا کے بیشتر ناکامی پر ختم ہونے والے منصوبوں کے بارے میں، کسی خاص افسوس

کے بغیر، باتیں کیں۔

مجھے یاد ہے کہ ابا کے جانے کے بعد میں کئی دن اس سوٹ کیس کو چھوئے بغیر اس کے آس پاس پھرتا رہا۔ چمڑے کے بنے اس چھوٹے، سیاہ سوٹ کیس، اس کے تالے اور گول کیے ہوے کناروں سے میں اپنے بچپن سے واقف رہا تھا۔ ابا کسی مختصر سفر پر جاتے ہوے اسے ساتھ لے جاتے اور بعض اوقات اسے گھر سے دفتر چیزیں لانے لے جانے کے لیے استعمال کرتے۔ جب ابا کسی سفر سے لوٹتے تو میں اس چھوٹے سوٹ کیس کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیتا اور مجھے یاد ہے کہ اس میں سے نکلنے والی کولون اور اجنبی ملکوں کی مہک مجھے بہت بھاتی تھی۔ یہ سوٹ کیس میرے لیے ایسی نشانی کی طرح تھا جو ماضی اور بچپن کی بہت سی یادوں کو اپنے اندر سموئے ہوے ہو، مگر اب میں اس کو چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیوں؟ بلاشبہ اس میں چھپا کر رکھی ہوئی چیزوں کے اسرار انگیز وزن کی وجہ سے۔

اب میں اس وزن کے مفہوم کی بات کروں گا۔ ایک کمرے میں بند ہو کر، میز پر بیٹھ کر، گوشہ گیر ہو کر، کوئی شخص کاغذ اور قلم کے ذریعے اپنا اظہار کرتا ہے — یہی ادب کے معنی ہیں۔

ابا کے سوٹ کیس کو چھو کر بھی میں اسے کھولنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکا، لیکن میں اس میں رکھی ڈائریوں کو جانتا تھا۔ میں نے ان میں سے بعض میں ابا کو کچھ لکھتے ہوے دیکھا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں تھا کہ میں نے اس سوٹ کیس کے اندر رکھے وزن کا ذکر سنا ہو۔ ابا کی جوانی کے دنوں میں، ۱۹۴۰ء کے عشرے کے آخری برسوں میں، ان کا ایک بڑا کتب خانہ تھا، وہ استنبول میں شاعر بننے کی خواہش رکھتے تھے اور والیری کا ترکی میں ترجمہ کر چکے تھے، لیکن انھیں وہ دشوار زندگی گزارنے کی خواہش نہ تھی جو ایک غریب ملک میں، جہاں پڑھنے والوں کی تعداد قلیل ہو، کسی شاعر کے حصے میں آتی ہے۔ ان کے ابا، یعنی میرے دادا، ایک مالدار تاجر تھے، اور ابا کے بچپن اور جوانی کے دن آرام دہ ماحول میں گزرے تھے اور وہ ادب یا تحریر کے مشغلے کی خاطر مشکل اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ زندگی سے اس کی ساری خوبصورتیوں سمیت محبت کرتے تھے، میں یہ بات سمجھتا تھا۔

ابا کے سوٹ کیس میں رکھی چیزوں سے مجھے دور رکھنے والا پہلا یہ خوف تھا کہ میں جو کچھ پڑھوں گا وہ مجھے پسند نہیں آئے گا۔ چونکہ ابا یہ بات جانتے تھے اس لیے انھوں نے احتیاطاً یوں ظاہر کیا تھا جیسے ان تحریروں کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ زندگی کے پچیس سال لکھنے میں گزارنے کے بعد یہ دیکھنا

میرے لیے غم انگیز تھا۔ لیکن میں ادب کو کافی سنجیدگی سے نہ لینے پر ابا کے لیے غصہ بھی محسوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا اصل خوف، اصل بات جسے میں جاننا یا دریافت کرنا بھی نہیں چاہتا تھا، یہ احتمال تھا کہ شاید ابا ایک اچھے ادیب رہے ہوں۔ دراصل یہی وجہ تھی کہ میں ابا کا سوٹ کیس کھولنے سے خوفزدہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنے آپ سے اس کا اعتراف بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر ابا کے سوٹ کیس سے اصل اور بڑا ادب برآمد ہوتا تو مجھے ابا کی ذات میں ایک بالکل مختلف شخص کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا۔ یہ ایک خوفناک بات تھی۔ کیونکہ اتنی عمر کا ہو جانے کے باوجود میں اپنے ابا کو صرف ابا کے طور پر قبول کرنا چاہتا تھا، کسی ادیب کے طور پر نہیں۔

میرے نزدیک ادیب انسان کے اندر چھپا ہوا دوسرا شخص ہوتا ہے جسے دریافت کرنے کے لیے، اور اس کو وجود میں لانے والے عالم کو دریافت کرنے کے لیے، اسے برسوں صبر کے ساتھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے: ادب کی بات کرتے ہوئے جو شے سب سے پہلے میرے ذہن میں آتی ہے وہ کوئی ناول، شعر یا ادبی روایت نہیں بلکہ وہ شخص ہے جس نے خود کو اکیلے کمرے میں بند کر کے، میز پر بیٹھ کر، اپنا رخ اندر کی طرف پھیر لیا ہو، اور اس گوشہ نشینی کے سائے میں لفظوں سے ایک نئی دنیا تخلیق کر رہا ہو۔ یہ شخص —— مرد یا عورت —— ٹائپ رائٹر استعمال کرسکتا ہے، کمپیوٹر کی سہولت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، یا فاؤنٹین پین سے کاغذ پر ہاتھ سے لکھ سکتا ہے، جیسا کہ میں تیس برس سے کرتا آیا ہوں۔ لکھنے کے دوران وہ قہوہ، چائے یا سگریٹ پی سکتا ہے۔ وقتاً فوقتاً میز سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر سڑک پر کھیلتے ہوئے بچوں، اتفاق سے دکھائی دینے والے درختوں کے منظر یا کسی تاریک دیوار کو دیکھ سکتا ہے۔ شعر، ڈراما یا میری طرح ناول لکھ سکتا ہے۔ یہ سارے فرق میز پر بیٹھنے اور صبر سے اپنا رخ اندر کی طرف پھیر لینے کے اصل عمل کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ لکھنے کا مطلب اس اندر کی سمت دیکھنے والی نگاہ کو لفظوں میں ڈھالنا، اور گوشہ نشیں ہونے کے بعد اپنے اندر کی دنیا کا مطالعہ کرنا ہے، اور یہ عمل صبر، ضد اور سرخوشی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ خالی صفحے پر الفاظ جوڑتے ہوئے، اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے دن، مہینے اور سال گزارتے ہوئے، مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک نئی دنیا کو تخلیق کر رہا ہوں، جیسے اپنے اندر کے شخص کو وجود میں لا رہا ہوں، بالکل اس طرح جیسے کوئی ایک ایک پتھر رکھ کر پل یا گنبد تعمیر کر رہا ہو۔ ہم ادیب جو پتھر استعمال کرتے ہیں وہ لفظ ہیں۔ انھیں ہاتھوں میں تھام کر، اس بات کا اندازہ لگاتے

ہوے کہ ہر لفظ دوسرے لفظوں کے ساتھ کس کس طریقے سے جڑ سکتا ہے، کبھی انھیں فاصلے سے دیکھتے ہوے، کبھی بہت قریب سے ان کو اپنی انگلیوں یا قلم کی نوک سے چھوتے ہوے، ان کو تولتے ہوے، انھیں ایک دوسرے پر جما جما کر، برسوں کے دوران، صبر، ضد اور امید کے ساتھ، ہم نئی دنیائیں تعمیر کرتے ہیں۔

میرے نزدیک کسی ادیب کا راز الہام میں نہیں — کیونکہ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ الہام کہاں سے آتا ہے — بلکہ ادیب کی ضد اور اس کے صبر میں پوشیدہ ہے۔ ترکی زبان کی وہ خوبصورت کہاوت — سوئی سے کنواں کھودنا — مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ادیبوں ہی کے لیے وضع کی گئی تھی۔ پرانی حکایتوں میں مجھے فرہاد کا صبر بہت عزیز ہے جس نے عشق کی خاطر پہاڑ کریدا تھا، اور میں اسے سمجھتا بھی ہوں۔ اپنے ناول *My Name is Red* میں جہاں میں نے ان قدیم ایرانی میناتورسازوں (miniaturists) کا تذکرہ کیا ہے جو برسوں ایک ہی گھوڑے کا نقش کھینچنے کی مشق کیا کرتے تھے، مو قلم کی ایک ایک جنبش کو ذہن نشیں کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ آنکھیں بند کر کے بھی اس خوبصورت گھوڑے کا نقش کھینچنے پر قادر ہو جائیں، وہاں میں جانتا تھا کہ میں لکھنے کے مسلک کی، خود اپنی زندگی کی بات کر رہا ہوں۔ اپنی زندگی کو، دوسرے انسانوں کی کہانی کی طرح، آہستہ آہستہ، بیان کرنے، اس بیان کرنے کی قوت کو اپنے اندر محسوس کرنے، میز پر بیٹھ کر صبر کے ساتھ خود کو اپنے فن، اپنے ہنر کے سپرد کر دینے کے لیے کسی ادیب کو سب سے پہلے امید پرستی حاصل ہونا ضروری ہے۔ الہام کا فرشتہ بعض ادیبوں کے پاس اکثر آتا ہے اور بعض کے پاس کبھی نہیں، لیکن وہ ان ادیبوں کو پسند کرتا ہے جو امید اور اعتماد رکھتے ہیں، اور جس وقت کوئی ادیب خود کو سب سے زیادہ تنہا محسوس کر رہا ہو، جس وقت وہ اپنی کوششوں، اپنے خوابوں اور اپنی تحریر کی قدر و قیمت کے بارے میں سب سے زیادہ شبہے میں مبتلا ہو — جس وقت وہ اس خیال کا شکار ہو جائے کہ اس کی کہانی محض اس کی اپنی کہانی ہے — ٹھیک اس لمحے الہام کا فرشتہ اس پر ایسی کہانیاں، مناظر اور خواب منکشف کر دیتا ہے جو اس دنیا کی تعمیر میں کام آ سکیں جسے وہ تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ لکھنے کا کام جس میں میں نے اپنی پوری عمر گزاری ہے، اس کے بارے میں سوچتے ہوے میرا سب سے زیادہ متاثر کن احساس یہ ہوتا ہے کہ یہ جملے، یہ خیالات اور یہ صفحات جنھوں نے مجھے اس قدر سرشاری اور مسرت بخشی، دراصل میرے تخیل کی

پیداوار نہیں تھے —— کہ انھیں کسی اور قوت نے تلاش کر کے دریا دلی کے ساتھ مجھے عطا کر دیا تھا۔

میں ابا کا سوٹ کیس کھولنے اور ان کی ڈائریوں کو پڑھنے سے خوفزدہ رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ ان دشواریوں کو برداشت نہ کرتے جو میں سہتا چلا آیا تھا، کہ وہ تنہائی کے دلدادہ نہیں تھے بلکہ انھیں دوستوں کی محفلیں، ہجوم، صحبت گاہ، ہنسی مذاق، اور رفیقوں کا ساتھ پسند تھا۔ لیکن بعد میں میں اس بارے میں ایک مختلف انداز سے سوچنے لگا۔ دنیا کو تج کر گوشہ گیری اور صبر اختیار کرنے کے یہ خیالات اصل میں میرے تعصبات ہو سکتے تھے جنھیں میں نے ایک ادیب کے طور پر اپنی زندگی اور اپنے تجربات سے اخذ کیا تھا۔ ایسے بہت سے عمدہ ادیب رہے ہیں جو بھیڑ بھاڑ اور گھریلو زندگی کے درمیان، رفاقت اور پرمسرت گپ شپ کی چمک دمک میں رہتے ہوئے بھی لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ، ہمارے بچپن میں، ایک بار ابا گھریلو زندگی کی یکسانی سے اکتا کر ہمیں چھوڑ کر پیرس چلے گئے تھے جہاں —— بہت سے ادیبوں کی طرح —— وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ڈائریوں کے صفحات بھرنے میں مصروف رہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان میں سے بعض ڈائریاں سوٹ کیس میں اس لیے بھی رکھی ہیں کہ اسے میرے سپرد کرنے سے پہلے کے چند برسوں میں وہ آخرکار مجھ سے اپنی زندگی کے اُس دور کے بارے میں بات کرنے لگے تھے۔ وہ ان برسوں کے بارے میں اُس وقت بھی بات کرتے تھے جب میں کم عمر تھا، لیکن انھوں نے کبھی اپنی اس کشمکش، ادیب بننے کی آرزو اور شناخت سے متعلق ان سوالوں کا ذکر نہیں کیا تھا جو ہوٹل کے کمرے میں ان کو درپیش رہے تھے۔ اس کے بجائے وہ مجھے ان موقعوں کے بارے میں بتاتے جب انھوں نے سارتر کو پیرس کے فٹ پاتھوں پر گزرتے دیکھا، یا اپنی پڑھی ہوئی کتابوں یا دیکھی ہوئی فلموں کا ذکر کرتے، اور ان کی اس گفتگو سے کسی ایسے شخص کا خلوص ظاہر ہوتا جو کوئی نہایت اہم خبر سنا رہا ہو۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو یہ بات میرے ذہن سے کبھی فراموش نہیں ہوئی کہ میرے ادیب بننے کی وجہ یہ بھی تھی کہ میرے ابا نے مجھ سے پاشاؤں اور بڑے مذہبی پیشواؤں سے کہیں زیادہ دنیا کے عظیم ادیبوں کا تذکرہ کیا تھا۔ شاید مجھے اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے ابا کی ڈائریاں پڑھنی تھیں، اور ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا تھا کہ میں ان کے وسیع کتب خانے کا کس قدر احسان مند تھا۔ مجھے یہ بات بھی ذہن میں رکھنی تھی کہ جن دنوں ابا ہمارے ساتھ رہتے تھے ان کو، میری ہی طرح، اپنے کمرے میں اکیلے، صرف کتابوں کے ساتھ، وقت گزارنا

اور اپنے خیالوں سے گتھم گتھا رہنا بہت پسند تھا — اور مجھے ان کی تحریروں کے ادبی معیار کو زیادہ اہمیت دیے بغیر ان پر توجہ دینی تھی۔

لیکن ابا کے سوٹ کیس پر بے چینی سے نظر ڈالتے ہوئے مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ یہی ایک کام ہے جو میں نہیں کر پاؤں گا۔ ابا کبھی کبھی اپنے کتب خانے کے سامنے کے دیوان پر لیٹ جاتے، اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی کتاب یا رسالے کو رکھ کر کسی خواب میں چلے جاتے یا خود کو طویل عرصے کے لیے اپنے خیالوں میں گم کر دیتے۔ جب میں ان کے چہرے پر ایک ایسا تاثر دیکھتا جو گھریلو زندگی کے ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اور بحث و تکرار کے دوران ان کے چہرے کے تاثر سے مختلف ہوتا — جب مجھے ان کے چہرے پر اُس دروں بیں نگاہ کے پہلے آثار دکھائی دیتے — خاص طور پر اپنے بچپن اور لڑکپن کے دنوں میں، میں سراسیمہ ہو کر یہ سمجھتا کہ وہ بے چین ہو رہے ہیں۔ اب، اتنے برس گزر جانے کے بعد، میں جانتا ہوں کہ یہ بے چینی وہ پہلی خصوصیت ہے جو کسی شخص کو ادیب بناتی ہے۔ ادیب بننے کے لیے صرف صبر اور ریاضت ہی کافی نہیں: سب سے پہلے ہمیں ہجوم، رفاقت، اور روزمرہ کی عام زندگی سے فرار ہونے اور خود کو کمرے میں بند کر لینے کی زبردست خواہش محسوس ہونی چاہیے۔ ہم صبر اور امید کی تمنا کرتے ہیں تاکہ اپنی تحریر میں ایک عمیق دنیا کو تخلیق کر سکیں۔ لیکن خود کو کمرے میں بند کر لینے کی خواہش ہی وہ شے ہے جو ہمیں عمل پر اکساتی ہے۔ کتابوں کے مطالعے سے کیف حاصل کرنے والے، صرف اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھر کر دوسروں کے کہے ہوئے لفظوں سے اختلاف کرنے والے، کتابوں سے مکالمہ کرنے کے ذریعے اپنے خیالات اور اپنی دنیا کو وضع کرنے والے آزاد ادیب کی پہلی مثال، جدید ادب کے اولیں دنوں میں یقینی طور پر مونتین (Montaigne) میں دکھائی دیتی ہے۔ مونتین ایک ایسا ادیب تھا جس کی طرف ابا اکثر لوٹتے تھے اور جسے پڑھنے کی مجھ سے سفارش کرتے تھے۔ میں خود کو بھی ادیبوں کی اس روایت سے منسلک کرنے کا خواہش مند ہوں جو — دنیا میں کسی بھی جگہ، مغرب میں یا مشرق میں — خود کو معاشرے سے کاٹ کر، کتابوں کے ساتھ کمرے میں بند کر لیتے ہیں۔ میرے نزدیک اصل ادب کا نقطۂ آغاز یہی ہے کہ کوئی شخص خود کو کتابوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بند کر لے۔

لیکن سب سے الگ تھلگ، کمرے میں بند ہو کر ہم اتنے اکیلے نہیں ہوتے جتنا ہم نے سمجھ رکھا

تھا۔ ہم ان ادیبوں کے لفظوں کی رفاقت میں ہوتے ہیں جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں، ہم دوسروں کی کہانیوں، دوسروں کی کتابوں، دوسروں کے لفظوں، یعنی اُس شے کی رفاقت میں ہوتے ہیں جسے ہم روایت کہتے ہیں۔ میرے نزدیک ادب وہ سب سے زیادہ قابلِ قدر ذخیرہ ہے جو انسانیت نے خود کو سمجھنے کی کوشش کے دوران جمع کیا ہے۔ قومیں، قبیلے اور معاشرے جوں جوں اپنے لکھنے والوں کے لفظوں پر توجہ دیتے جاتے ہیں، اتنے ہی زیادہ ذکی، پُر مایہ اور ترقی یافتہ ہوتے جاتے ہیں، اور، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، کتابوں کو جلانا اور ادیبوں کو رسوا کرنا کسی قوم کو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ایک تاریک اور بے عقل دور اس پر مسلط ہونے کو ہے۔ لیکن ادب کبھی بھی محض قومی معاملہ نہیں ہوتا۔ ادیب جب خود کو کتابوں کے ساتھ کمرے میں بند کر کے اپنے اندر کے سفر پر نکلتا ہے تو، رفتہ رفتہ، ادب کے قدیم اور ناگزیر اصول کو دریافت کر لیتا ہے: اسے وہ ہنر حاصل ہونا چاہیے کہ اپنی کہانیاں یوں بیان کر سکے جیسے وہ دوسروں کی کہانیاں ہوں، اور دوسروں کی کہانیاں اس طرح سنا سکے جیسے وہ اس کی اپنی کہانیاں ہوں، کیونکہ ادب اسی کا نام ہے۔ لیکن اس کے لیے ہمیں دوسرے لوگوں کی کہانیوں اور کتابوں میں سے گزرنا ہوتا ہے۔

ابا کا کتب خانہ بہت اچھا تھا۔ اس میں کل ڈیڑھ ہزار کتابیں تھیں — جو کسی ادیب کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔ میں نے بائیس سال کی عمر کو پہنچنے تک شاید وہ تمام کتابیں نہیں پڑھیں، لیکن میں ان میں سے ہر کتاب سے مانوس تھا — میں جانتا تھا کہ ان میں سے کون سی اہم ہیں، کون سی ہلکی پھلکی، آسانی سے پڑھی جانے والی ہیں، کون سی کلاسیک ہیں، کون سی دنیا کی کسی بھی تعلیم کا ناگزیر حصہ ہیں، کون سی مقامی تاریخ کے قابلِ فراموش لیکن پُر لطف قصوں پر مشتمل ہیں، اور کون سی ان فرانسیسی ادیبوں کی تحریر کی ہوئی ہیں جنھیں ابا بہت اونچا درجہ دیتے تھے۔ کبھی کبھی میں ان کے کتب خانے کو ذرا فاصلے سے دیکھتا اور یہ تصور کرتا کہ ایک دن، کسی اور مکان میں، میں اپنا ایسا ہی بلکہ اس سے بھی اچھا کتب خانہ بناؤں گا — اپنے لیے ایک دنیا تعمیر کروں گا۔ جب میں ابا کے کتب خانے کو فاصلے سے دیکھتا تو وہ مجھے پوری دنیا کی ایک چھوٹی سی تصویر معلوم ہوتا۔ لیکن یہ ایسی دنیا تھی جس کا مشاہدہ ہمارے اپنے گوشے سے، استنبول سے کیا جا رہا تھا۔ کتب خانہ اسی کی شہادت دیتا تھا۔ ابا نے یہ کتب خانہ اپنے غیر ملکی سفروں کے دوران، بیشتر پیرس اور امریکہ سے لائی گئی کتابوں سے بنایا تھا، لیکن اس میں استنبول

کی ان دکانوں سے خریدی ہوئی کتابیں بھی شامل تھیں جہاں ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کے عشروں میں غیر ملکی زبانوں کی کتابیں فروخت کی جاتی تھیں، اور ان پرانی اور نئی کتابیں بیچنے والوں سے خریدی ہوئی کتابیں بھی، جن سے میں بھی واقف تھا۔ میری دنیا مقامی یا قومی دنیا اور مغربی دنیا کا آمیزہ ہے۔

۱۹۷۰ء کے عشرے میں میں نے، کچھ زیادہ ہی بلند عزائم کے ساتھ، اپنا کتب خانہ جمع کرنا شروع کیا۔ میں نے ادیب بننے کا پوری طرح فیصلہ نہیں کیا تھا — جیسا کہ میں نے اپنی کتاب *Istanbul* میں بیان کیا ہے، میں محسوس کر رہا تھا کہ میں مصور تو بہرحال نہیں بنوں گا لیکن مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ میری زندگی کون سا راستہ اختیار کرے گی۔ میرے اندر ایک طرف ہر شے کے بارے میں پڑھنے اور سیکھنے کی ایک شدید اور ختم نہ ہونے والی جستجو اور امید پرستانہ، طاقتور خواہش موجود تھی، لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ میری زندگی میں کسی نہ کسی طرح کی کمی رہے گی، کہ میں دوسروں کی طرح زندگی نہیں گزار سکوں گا۔ میرے اس احساس کا تعلق کسی حد تک اس خیال سے تھا جس کا تجربہ مجھے ابا کے کتب خانے کو دیکھ کر ہوتا تھا — مرکز سے دور، اضلاع میں زندگی گزارنے کا خیال، جو استنبول کے ہم سب رہنے والوں پر اُن دنوں مسلط رہتا تھا۔ کسی چیز کے کم ہونے کے خیال اور اس سے محسوس ہونے والی تشویش کا ایک اور سبب بھی تھا: مجھے بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ میں ایک ایسے ملک میں رہتا ہوں جسے فنکاروں سے — خواہ وہ مصور ہوں یا ادیب — کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے اور جو اپنے فنکاروں کو بہت امید نہیں دلاتا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں، جب میں، ابا کے دیے ہوئے پیسوں سے، استنبول کے پرانی کتابیں بیچنے والوں سے مٹتے ہوئے حروف والی، گردآلود، کونے مڑی کتابیں خریدتا تو ان پرانی کتابوں کی دکانوں کی قابلِ رحم حالت سے، اور سڑک کے کنارے، مسجدوں کے احاطوں میں اور شکستہ ہوتی دیواروں کے سائے میں کتابیں بیچنے والے مفلس، شکن آلود کتب فروشوں کی افسوسناک پریشان حالی سے بھی اتنا ہی متاثر ہوتا جتنا ان کتابوں سے۔

جہاں تک دنیا میں اپنے مقام کا تعلق ہے — زندگی میں بھی اسی طرح جیسے ادب میں — میرا بنیادی احساس یہی تھا کہ میں ''مرکز میں نہیں ہوں''۔ دنیا کے مرکز میں وہ زندگی تھی جو ہماری زندگیوں سے کہیں زیادہ پُرمایہ اور جوش انگیز تھی، اور میں، استنبول اور ترکی کے سب رہنے والوں سمیت، اس سے باہر تھا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ میرا یہ احساس دنیا کے بیشتر لوگوں میں مشترک ہے۔ اسی طرح

ایک عالمی ادب تھا، اور اس کا مرکز بھی مجھ سے بہت دور کہیں واقع تھا۔ دراصل میں جس ادب کے بارے میں سوچتا تھا وہ عالمی نہیں بلکہ مغربی ادب تھا، اور ہم ترکی کے رہنے والے اس سے باہر تھے۔ ابا کا کتب خانہ بھی اس بات کی شہادت دیتا تھا۔ ایک کنارے پر استنبول کی کتابیں تھیں — ہمارا ادب، ہماری مقامی دنیا، اپنی تمام محبوب تفصیلات سمیت — اور دوسرے کنارے پر اُس دوسری، مغربی دنیا کی کتابیں تھیں جس سے ہماری دنیا ذرا بھی مشابہت نہ رکھتی تھی، جس سے مشابہت کی کمی ہمیں تکلیف بھی دیتی تھی اور امید بھی دلاتی تھی۔ لکھنا، پڑھنا، دراصل ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا کی اجنبیت، انوکھے پن اور حیرت انگیزی میں تسکین ڈھونڈنا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ ابا ناول اس لیے پڑھتے تھے تاکہ اپنی زندگی سے فرار ہو کر مغرب میں جا چھپیں — جیسا کہ بعد میں میں نے بھی کیا۔ یا اُن دنوں مجھے ایسا لگتا کہ کتابیں ان چیزوں کا نعم البدل ہیں جن کی ہمیں اپنی ثقافت میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ پڑھنا ہی نہیں، لکھنا بھی استنبول میں اپنی زندگیوں سے نکل کر مغرب کا سفر کرآنے کا ذریعہ تھا۔ سوٹ کیس میں رکھی بیشتر ڈائریوں کے صفحات بھرنے کے لیے ابا پیرس گئے تھے جہاں انھوں نے خود کو ہوٹل کے کمرے میں بند کرلیا تھا اور پھر اپنی تحریریں لے کر ترکی لوٹ آئے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ ابا کے سوٹ کیس پر نظر ڈالتے ہوئے یہ بات بھی مجھے بےچین کرتی ہے۔ ترکی میں ایک ادیب کے طور پر زندہ رہنے کے لیے پچیس برس کمرے میں بند رہ کر کام کرنے کے بعد مجھے یہ بات ناقابلِ برداشت محسوس ہوتی تھی کہ ابا نے اپنے ان گہرے خیالات کو سوٹ کیس میں چھپائے رکھا، یوں ظاہر کیا جیسے لکھنا کوئی راز میں رکھا جانے والا عمل ہو، جسے معاشرے سے، ریاست سے، لوگوں سے پوشیدہ رکھنا ضروری ہو۔ شاید یہی اصل وجہ تھی کہ مجھے ابا پر غصہ آیا کہ انھوں نے میری طرح ادب کو اتنی سنجیدگی سے کیوں نہیں لیا۔

دراصل مجھے ابا پر غصہ تھا کیونکہ انھوں نے میری جیسی زندگی نہیں گزاری تھی، ان کا اپنی زندگی سے کبھی تنازع نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے درمیان خوش و خرم رہے۔ لیکن میں اپنے اندر یہ بات بھی جانتا تھا کہ مجھے اتنا 'غصہ' محسوس نہیں ہو رہا ہے جتنا 'حسد' — شاید یہ موخرالذکر لفظ ہی زیادہ درست ہے — اور یہ بات بھی مجھے بےچینی میں مبتلا کر رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں اپنی معمول کی ملامت آمیز، ناراض آواز میں خود سے سوال کرتا: ''خوشی کیا ہے؟'' کیا خوشی یہ سوچنے میں

ہے کہ میں نے اپنے اس تنہا کمرے میں ایک عمیق زندگی گزاری ہے؟ یا اس کا مطلب معاشرے کے درمیان رہ کر، وہی کچھ مانتے ہوئے جو دوسرے لوگ مانتے ہیں، یا کم از کم اپنے عمل سے یہی ظاہر کرتے ہوئے، ایک آرام دہ زندگی گزارنا ہے؟ کیا یہ خوشی ہے یا ناخوشی کہ انسان زندگی کو پوشیدہ طور پر لکھنے میں بسر کرے جبکہ عیاں طور پر وہ اپنے اردگرد کے لوگوں سے مطابقت میں رہ رہا ہو؟ لیکن یہ سب ضرورت سے زیادہ جھنجھلاہٹ پر مبنی سوالات تھے۔ مجھے یہ خیال کہاں سے سوجھ گیا کہ اچھی زندگی کا سب سے اہم پیمانہ خوشی ہے؟ لوگ، اخبارات، ہر شخص یہی ظاہر کیا کرتا کہ خوشی زندگی کا اہم ترین پیمانہ ہے — کیا یہی بات اس کے لیے کافی نہیں کہ پرکھ کر دیکھ لیا جائے، شاید حقیقت اس کے بالکل برعکس ہو؟ آخر اتنی بار ابا اپنے گھر سے فرار ہو کر دور چلے گئے تھے — میں انھیں کتنی اچھی طرح جانتا ہوں اور کتنے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی بے چینی میری سمجھ میں آتی ہے؟

چنانچہ جب میں نے ابا کا سوٹ کیس پہلی بار کھولا تو یہی بات مجھے تحریک دے رہی تھی۔ کیا ابا کی زندگی میں کوئی راز تھا، کوئی ناخوشی، جس سے میں بالکل ناواقف رہا تھا، جس کو برداشت کرنے کا ان کے پاس یہ واحد طریقہ تھا کہ وہ اسے اپنی تحریر میں سمو دیں؟ سوٹ کیس کھولتے ہی مجھے سفر کی وہی مہک یاد آ گئی، میں نے اس میں رکھی کئی ڈائریوں کو پہچان لیا اور مجھے یاد آیا کہ ابا نے یہ برسوں پہلے مجھے دکھائی تھیں لیکن ان کے بارے میں زیادہ دیر بات نہیں کی تھی۔ زیادہ تر ڈائریاں جنھیں میں نے اپنے ہاتھ میں لیا وہ تھیں جن کے صفحات کو ابا نے اپنی جوانی کے دنوں میں اس وقت بھرا تھا جب وہ ہم سے دور، پیرس میں تھے۔ ان بہت سے ادیبوں کی طرح جو مجھے محبوب تھے — جن کی سوانح عمریاں میں نے پڑھ رکھی تھیں — میں جاننا چاہتا تھا کہ ابا، اس عمر میں جس عمر کا میں اب ہوں، کیا لکھتے تھے، کیا سوچتے تھے۔ مجھے یہ بات جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ ان ڈائریوں میں مجھے ایسی کوئی چیز ہاتھ نہیں آئے گی۔ مجھے سب سے زیادہ بے چینی اس وقت محسوس ہوتی جب ابا کی تحریر میں، کہیں کہیں، مجھے ایک ادیب کی سی آواز سنائی دیتی۔ یہ ابا کی آواز نہیں ہے، میں خود کو بتاتا، یہ ان کی اصل آواز نہیں ہے، کم از کم یہ اُس شخص کی آواز نہیں ہے جس سے میں اپنے ابا کے طور پر واقف رہا ہوں۔ میرے اس خوف کی تہہ میں، کہ ابا لکھتے وقت میرے ابا نہیں رہے ہوں گے، ایک اس سے زیادہ گہرا خوف پنہاں تھا: یہ کہ کہیں، اپنے بہت اندر، میں بھی حقیقی شخص نہیں ہوں، کہ مجھے ابا کی تحریروں میں کوئی اچھی چیز

ہاتھ نہیں آئے گی۔ اس خیال سے میرا یہ خوف اور بڑھ گیا کہ مجھے معلوم ہوگا کہ ابا پر دوسرے ادیبوں کا بہت زیادہ اثر رہا ہے، اور اس خیال نے مجھے اسی مایوسی میں مبتلا کر دیا جس نے نوجوانی کے دنوں میں مجھ پر اس بری طرح حملہ کر دیا تھا کہ میں اپنی زندگی، اپنے پورے وجود، اپنی لکھنے کی خواہش اور اپنی تحریر سب کے بارے میں شک میں پڑ گیا تھا۔ ناول نگاری کے پہلے دس برسوں کے دوران میں نے اس شک اور اضطراب کو انتہائی گہرائی میں محسوس کیا اور اس کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی مجھے کبھی کبھی خوف ہوتا تھا کہ ایک دن مجھے شکست تسلیم کرنی ہی پڑے گی — جیسے میں نے مصوری کے میدان میں ہار مان لی تھی — اور خود کو اپنی بے اطمینانی کے حوالے کرتے ہوئے، ناول نگاری کو بھی خیر باد کہنا ہوگا۔

میں نے اپنے ان دو احساسات کو بیان کیا ہے جو ابا کا سوٹ کیس بند کر کے ایک کونے میں رکھتے ہوئے میرے اندر بیدار ہوئے تھے: یہ احساس کہ میں مرکز سے دور کسی غیر اہم جگہ رہ رہا ہوں، اور یہ خوف کہ میں حقیقی (authentic) ادیب نہیں ہوں۔ بلاشبہ ان مضطرب کن احساسات سے میرا پہلی بار سابقہ نہیں پڑ رہا تھا۔ میں برسوں، اپنی میز پر بیٹھ کر لکھنے اور پڑھنے کے دوران، ان احساسات کو ان کے ضمنی نتائج، حساس اعصابی ریشوں، ان کی اندرونی گرہوں اور بے شمار رنگوں سمیت بار بار دریافت کرتا رہا ہوں، ان کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں، انھیں اور زیادہ گہرا کرتا رہا ہوں۔ بلاشبہ زندگی اور کتابوں سے جنم لینے والے اس مضطرب کن احساس اور آتے جاتے درد کے ہاتھوں میرا حوصلہ جواب دیتا رہا ہے، خاص طور پر اُن دنوں جب میں جوان آدمی تھا۔ لیکن یہ کتابیں لکھنے ہی سے ممکن ہوا کہ میں حقیقی پن (authenticity) کی بابت تشویش کو زیادہ مکمل طور پر سمجھ سکا (مثلاً *My Name is Red* اور *The Black Book* میں) یا مرکز سے دور، حاشیے پر رہنے کے احساس کو زیادہ گہرائی میں جان سکا (مثلاً *Snow* یا *Istanbul* میں)۔ میرے نزدیک ادیب ہونے کا مطلب ان زخموں کو تسلیم کرنا ہے جو ہم اپنے وجود میں پوشیدہ رکھتے ہیں، جو اس قدر مستور ہوتے ہیں کہ خود ہمیں بھی ان کا بمشکل شعور ہوتا ہے، اور ادیب ہونے کا مطلب ان زخموں اور تکلیفوں کا صبر کے ساتھ متواتر مشاہدہ کرنا، انھیں جاننا، ان کو روشنی میں لانا، انھیں اپنانا اور اپنی شناخت اور تحریر کا شعوری جز بنانا ہے۔

ادیب ان چیزوں کا تذکرہ کرتا ہے جن کا سب لوگوں کو علم ہوتا ہے، لیکن انھیں اس علم کا ادراک نہیں ہوتا۔ اس علم کو کھوجنا، اسے بڑھتے ہوئے دیکھنا اور دوسروں کو اس میں شریک کرنا ایک

پرمسرت تجربہ ہے؛ پڑھنے والا حیرت کے ساتھ ایک ایسی اجنبی دنیا کی سیر کرتا ہے جو اس کے لیے مانوس بھی ہوتی ہے۔ یہ مسرت ہمیں اس علم کی سچائی سے اور اس ہنر کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے جس کی مدد سے یہ علم چھلک کر تحریر میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب کوئی ادیب خود کو برسوں کے لیے اپنے کمرے میں بند کر لیتا ہے تاکہ اپنے ہنر کو بہتر بنا سکے — ایک دنیا کو تخلیق کر سکے — تب، اپنے ان پوشیدہ زخموں کو اپنے نقطۂ آغاز کے طور پر استعمال کرتے ہوئے، وہ، دانستہ یا نادانستہ، انسانیت پر گہرائی سے یقین کر رہا ہوتا ہے۔ میرے اعتماد کا منبع میرا یہ یقین ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں، کہ دوسروں کے وجود میں بھی ویسے ہی زخم ہیں جیسے میرے وجود میں — اور یہ کہ یہی وجہ ہے کہ وہ میری بات سمجھ جائیں گے۔ تمام ادب اسی بچکانہ، پُرامید یقین کا سہارا لیتا ہے کہ سارے انسان ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ جب کوئی ادیب خود کو برسوں کے لیے کمرے میں بند کر لیتا ہے تو اپنے اس عمل سے وہ اسی انسانیت، اور ایک بے مرکز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میرے ابا کے سوٹ کیس سے، اور بلاشبہ استنبول میں گزرنے والی ہماری زندگیوں کے ماند رنگوں سے، ظاہر ہوتا ہے، دنیا کا ایک مرکز یقیناً تھا، اور وہ مرکز ہم سے بہت دور واقع تھا۔ اپنی کتابوں میں میں نے خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح زندگی کی سکھائی ہوئی اس بنیادی حقیقت نے صوبائیت (provinciality) کے ایک ایسے احساس کو ابھارا جو ہمیں چیخوف کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے، اور کس طرح، ایک اور راستے سے ہو کر، اس احساس نے مجھے خود اپنی اصلیت کے بارے میں تشویش میں مبتلا کیا۔ میں اپنے تجربے سے جانتا ہوں کہ اس زمین پر رہنے والے بیشتر انسان انھی احساسات کی پیدا کردہ گھٹن کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، اور یہ کہ بہت سے لوگ مجبور، غیرمحفوظ اور بے توقیر ہونے کا شدید خوف رکھتے ہیں۔ ہاں، انسانیت کو درپیش سب سے بڑی تکالیف اب بھی بے زمینی، بے گھری اور بھوک کی تکالیف ہیں... لیکن آج ہمارے ٹیلی وژن اور اخبار ہمیں ان بنیادی مسائل کی اطلاع اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری اور سادگی سے پہنچا دیتے ہیں جتنا ادب سے ممکن ہو سکتا ہے۔ آج ادب کو جن مسائل کے بیان اور تجزیے کی ضرورت ہے وہ انسانیت کی بنیادی تکالیف ہیں: الگ تھلگ رہ جانے کا خوف، بے قدر ہونے کا خوف، اور بے مصرف ہونے کا وہ احساس جو اس خوف کے ساتھ آتا ہے؛ اجتماعی تذلیل، خطرے کا احساس، تحقیر،

محرومی، حساسیت اور مفروضہ توہین، اور ان سب سے بہت قریبی طور پر منسلک قومی غرور اور مبالغہ آمیزی... جب کبھی ایسے جذبات سے، اور اس غیر عقلی، ضرورت سے زیادہ شدید زبان سے جس میں ان کا اظہار کیا جاتا ہے، میرا سامنا ہوتا ہے، میں جان جاتا ہوں کہ یہ میرے اندر کی ایک تاریکی کو چھوتے ہیں۔ ہم نے مغرب سے باہر ایسے عوام، معاشروں اور قوموں کا اکثر مشاہدہ کیا ہے — اور میں آسانی سے خود کو ان کے ساتھ شناخت کر سکتا ہوں — جو ان احساسات کی تاب نہیں لا پاتے اور ان کے زیر اثر بعض اوقات حماقتیں کر بیٹھتے ہیں، صرف اس لیے کہ انھیں تذلیل کا ڈر ہوتا ہے اور وہ اس بارے میں بے حد حساس ہوتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مغرب میں — جس کے ساتھ بھی میں خود کو اتنی ہی آسانی سے شناخت کر سکتا ہوں — قومیں اور عوام اپنی مالی خوشحالی پر ضرورت سے زیادہ ناز کرتے ہیں، اور اس بات پر کہ انھوں نے ہمیں نشاۃ ثانیہ، روشن خیالی اور جدیدیت کا تحفہ دیا، اور وقتاً فوقتاً وہ ایک ایسی خود اطمینانی کا شکار ہو جاتے ہیں جو اتنی ہی احمقانہ ہوتی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے ابا اپنی قسم کے واحد شخص نہیں تھے، اور یہ کہ ہم سب ایک ایسی دنیا کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس کا ایک مرکز ہو۔ جبکہ وہ شے جو ہمیں خود کو برسوں تک کمرے میں بند کر کے لکھتے رہنے پر مجبور کرتی ہے، اس کے بالکل برعکس ہے: یہ یقین کہ ایک دن ہماری تحریروں کو پڑھا اور سمجھا جائے گا، کیونکہ دنیا کے تمام لوگ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ لیکن، جیسا کہ میں اپنی اور ابا کی تحریروں کے ذریعے سے جانتا ہوں، یہ ایک اذیت ناک امید پرستی ہے، اس غصے سے مجروح کہ ہمیں حاشیے پر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہے، کہ ہم الگ تھلگ رہ گئے ہیں۔ مغرب کی بابت وہ محبت اور نفرت جسے دستوئیفسکی ساری عمر محسوس کرتا رہا، اسے میں نے بھی بہت سے موقعوں پر محسوس کیا ہے۔ لیکن اگر میں کسی بنیادی حقیقت کو دریافت کر پایا ہوں، اگر میرے پاس حقیقی امید پرستی کا کوئی جواز ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس عظیم ادیب کے مغرب سے نفرت اور محبت کے رشتے میں سے ہو کر گزرا ہوں، اور میں نے اس دنیا کی سیر کی ہے جسے اُس نے، دوسرے کنارے پر، تعمیر کیا تھا۔

تمام ادیب جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کام میں لگا دیں، اس حقیقت سے واقف ہیں: ہمارا اصل مقصد جو کچھ بھی ہو، برسوں تحریر کے امید پرستانہ عمل میں مشغول رہ کر ہم جو دنیا تخلیق کرتے ہیں

وہ، آخر کار، بہت سے مختلف مقامات پر جا بستی ہے۔ یہ ہمیں اس میز سے بہت دور لے جاتی ہے جس پر بیٹھ کر ہم غم یا غصے کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں، یہ ہمیں اس غم اور غصے کے دوسری جانب، ایک اُور دنیا میں لے جاتی ہے۔ کیا ابا خود اس قسم کی دنیا تک نہیں پہنچ سکتے تھے؟ جس طرح ایک طویل سمندری سفر کے بعد زمین رفتہ رفتہ کسی جزیرے کی طرح دھند میں سے نکل کر اپنے تمام رنگوں سمیت مجسم ہوتی جاتی ہے، یہ دوسری دنیا ہمیں اسی طرح مسحور کرتی ہے۔ اس دنیا کی بابت ہمارا احساس ان مغربی سیاحوں کی کیفیت سے ملتا جلتا ہے جو جنوب کی سمت سے جہاز میں آتے ہوئے استنبول شہر کو دھند میں سے برآمد ہوتا ہوا دیکھتے تھے۔ امید اور تجسس کے عالم میں شروع ہونے والے لمبے سفر کے اختتام پر ان کے سامنے مسجدوں اور میناروں سے بھرا ایک شہر، مکانوں، گلیوں، پہاڑیوں، پلوں اور ڈھلانوں کا ایک مجموعہ، یعنی ایک مکمل دنیا ہوتی تھی۔ ہم اپنی نظروں کے سامنے ظاہر ہوتی ہوئی اس دنیا کو دیکھ کر اس میں داخل ہونے، اس میں خود کو گم کر دینے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں جیسے کوئی اچھا پڑھنے والا کسی کتاب میں گم ہو جاتا ہے۔ کسی میز پر اس وجہ سے بیٹھ کر کہ ہم مرکز سے دور، کسی صوبائی مقام پر، دنیا کے حاشیے پر ہیں، یا غصے یا گہری اداسی میں مبتلا ہیں، ہم نے ایک ایسی دنیا کو پا لیا جو ان تمام احساسات کو ذہن سے محو کر دینے کے لیے کافی ہے۔

میں اپنے بچپن اور جوانی میں جو محسوس کرتا تھا اب اس کا بالکل الٹ محسوس کرتا ہوں: میرے لیے اب دنیا کا مرکز استنبول ہے۔ اس کی صرف یہ وجہ نہیں کہ میں نے اپنی پوری زندگی یہیں گزاری ہے، بلکہ یہ کہ پچھلے تینتیس سال سے میں اس کی گلیوں، اس کے پلوں، اس کے باسیوں، اس کے کتوں، اس کے مکانوں، اس کی مسجدوں، اس کے فواروں، اس کے عجیب سورماؤں، اس کی دکانوں، اس کے مشہور کرداروں، اس کے تاریک گوشوں، اس کے دنوں اور اس کی راتوں کو اپنے وجود کا حصہ بناتے ہوئے، ان سب کو اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے، بیان کرتا آیا ہوں۔ ایک مقام ایسا آیا جب یہ دنیا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا، یہ دنیا جو صرف میرے سر میں آباد تھی، میرے نزدیک اُس شہر سے کہیں زیادہ حقیقی ہو گئی جس میں میں دراصل رہتا تھا۔ یہ اس وقت ہوا جب یوں لگا جیسے لوگ اور گلیاں، چیزیں اور عمارتیں ابھی ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں گی، آپس میں اس قسم کے عملی تعلق قائم کر لیں گی جس کی میں نے پیش گوئی نہیں کی تھی، جیسے وہ صرف میرے تخیل میں یا میری

کتابوں میں آباد نہیں بلکہ خود اپنے لیے زندہ رہنے لگی ہوں۔ یہ دنیا جسے میں نے اس طرح تخلیق کیا تھا جیسے کوئی شخص سوئی سے کنواں کھودتا ہو، ہر دوسری چیز سے بڑھ کر سچی معلوم ہونے لگی۔

ان برسوں کے دوران جو ابا نے لکھنے میں گزارے، ممکن ہے انھوں نے بھی اس قسم کی خوشی دریافت کی ہو، میں نے ان کے سوٹ کیس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا: مجھے ان سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ آخر میں ان کا اس قدر احسان مند تھا: وہ کبھی حکم چلانے والے، پابندیاں لگانے والے، تسلط قائم کرنے والے، سزا دینے والے، رواجی باپ نہیں رہے، بلکہ وہ ایسے باپ تھے جس نے مجھے ہمیشہ آزاد رہنے دیا، ہمیشہ مجھ سے نہایت احترام کا سلوک کیا۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر میں وقتاً فوقتاً اپنے تخیل سے کچھ اخذ کرنے کے قابل ہوا ہوں، خواہ یہ آزادی ہو یا بچکانہ پن، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ، اپنے بچپن اور جوانی کے بہت سے دوستوں کے برخلاف، مجھے اپنے باپ سے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا، اور میں نے اس بات پر ہمیشہ گہرا یقین رکھا ہے کہ اگر میں ادیب بن پایا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابا نے بھی، اپنی جوانی میں، ادیب بننے کی آرزو کی تھی۔ مجھے ان کی تحریروں کو تحمل کے ساتھ پڑھنا ہوگا — ہوٹل کے ان کمروں میں انھوں نے جو کچھ لکھا اسے سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی۔

ان پُرامید خیالات کے ساتھ میں چل کر اس سوٹ کیس تک گیا، جو اب تک اسی جگہ تھا جہاں ابا نے اسے رکھا تھا؛ اپنی پوری قوتِ ارادی سے کام لیتے ہوئے میں نے ان میں سے چند مسودوں اور ڈائریوں کا مطالعہ کیا۔ ابا نے کس بارے میں لکھا تھا؟ مجھے پیرس کے ہوٹلوں کی کھڑکیوں سے دیکھے ہوئے چند منظر یاد آتے ہیں، چند نظمیں، کچھ معمے، کچھ تجزیے... اس وقت یہ سطریں لکھتے ہوئے میں اس شخص کی طرح محسوس کر رہا ہوں جو ابھی ابھی ٹریفک کے کسی حادثے سے دوچار ہوا ہو اور ذہن پر زور ڈال کر یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہ حادثہ کس طرح پیش آیا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ زیادہ تفصیلات یاد کرنا بھی نہ چاہتا ہو۔ جب میں بچہ تھا، اور ابا اور امی آپس میں کسی جھگڑے کی نگر پر ہوتے تھے — جب وہ اُس ہلاکت خیز خاموشی میں چلے جاتے تھے — تو ابا موڈ تبدیل کرنے کے لیے فوراً ریڈیو چلا دیتے تھے، اور موسیقی ہمیں یہ سب کچھ تیزی سے بھلا دینے میں بہت مدد دیتی تھی۔

آیئے میں بھی موڈ کو تبدیل کرنے کے لیے چند خوشگوار لفظ کہوں جو، مجھے امید ہے کہ وہی کام کریں گے جو موسیقی کرتی تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ہم ادیبوں سے سب سے زیادہ موقعوں پر کیا

جانے والا، سب کا پسندیدہ سوال یہ ہے: آپ کیوں لکھتے ہیں؟ میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے لکھنے کی ایک فطری خواہش محسوس ہوتی ہے! میں لکھتا ہوں کیونکہ میں دوسرے لوگوں کی طرح کوئی نارمل کام نہیں کر سکتا۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ مجھے ویسی کتابیں پڑھنا اچھا لگتا ہے جیسی میں خود لکھتا ہوں۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ مجھے آپ سب پر، ہر ایک پر بہت غصہ آتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ مجھے دن بھر کمرے میں بیٹھ کر لکھنا بہت پسند ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ میں حقیقی زندگی کو تبدیل کیے بغیر سہار نہیں سکتا۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ دوسرے لوگ، ہم سب، پوری دنیا یہ جان لے کہ ہم استنبول میں، ترکی میں، کس طرح کی زندگی گزارتے آئے ہیں اور گزار رہے ہیں۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ کاغذ، قلم اور روشنائی کی خوشبو مجھے بھاتی ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ میں کسی بھی اور شے سے زیادہ ادب پر، ناول کے فن پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ یہ ایک عادت، ایک شوق ہے۔ میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے بھلا دیے جانے سے خوف آتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ مجھے وہ وقار اور توجہ پسند ہے جو لکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ میں تنہا ہونے کے لیے لکھتا ہوں۔ شاید میں اس لیے لکھتا ہوں کہ سمجھ سکوں کہ مجھے آپ سب پر اتنا زیادہ غصہ کیوں آتا ہے، ہر شخص پر اتنا زیادہ غصہ کیوں آتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ مجھے پڑھا جانا پسند ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ ایک بار جب میں کوئی ناول، کوئی مضمون، کوئی صفحہ شروع کر دوں تو میں اسے مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ ہر شخص مجھ سے لکھنے کی توقع کرتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ میرا کتب خانوں کے لافانی ہونے پر، شیلفوں میں اپنی کتابوں کے رکھے ہونے کے انداز کے لافانی ہونے پر بچکانہ عقیدہ ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ زندگی اور دنیا کی ہر چیز ناقابل یقین حد تک خوبصورت اور حیران کن ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ زندگی کی تمام زیبائیوں اور خزانوں کو لفظوں میں ڈھالنا بے حد مسرور کن کام ہے۔ میں کوئی کہانی سنانے کے لیے نہیں لکھتا بلکہ اسے ترتیب دینے کے لیے لکھتا ہوں۔ میں لکھتا ہوں تاکہ اس احساس سے فرار حاصل کر سکوں کہ کوئی جگہ ہے جہاں مجھے پہنچنا ہے لیکن — جیسا کہ خوابوں میں ہوتا ہے — میں وہاں پہنچ نہیں پاتا۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ میں کبھی خوش نہیں ہو سکا۔ میں خوش ہونے کے لیے لکھتا ہوں۔

میری مطالعہ گاہ میں آ کر اپنا سوٹ کیس میرے سپرد کرنے کے ایک ہفتے بعد ابا ایک بار پھر مجھ سے ملنے آئے؛ ہمیشہ کی طرح وہ میرے لیے ایک چاکلیٹ کا پیکٹ لائے تھے (وہ بھول چکے تھے

کہ میں اڑتالیس سال کا ہوں)۔ ہمیشہ کی طرح ہم زندگی، سیاست اور خاندانی قصوں کے بارے میں بات کرتے اور ہنستے رہے۔ ایک موقع ایسا آیا جب ابا کی نظریں کمرے کے اس گوشے کی طرف گئیں جہاں انھوں نے اپنا سوٹ کیس رکھا تھا، اور وہ سمجھ گئے کہ میں نے اسے سرکایا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے سے آنکھیں ملائیں۔ اس کے بعد ایک خجالت بھری خاموشی چھا گئی۔ میں نے انھیں نہیں بتایا کہ میں نے سوٹ کیس کھولا تھا اور اس میں رکھی چیزوں کو پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بجائے میں نے نظریں چرالیں۔ لیکن وہ سمجھ گئے۔ میں بھی سمجھ گیا کہ وہ سمجھ گئے ہیں۔ وہ یہ بات بھی سمجھ گئے۔ لیکن یہ سمجھنا اتنا ہی تھا جتنا چند سیکنڈ میں ممکن ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ابا ایک مسرور، خوش باش آدمی تھے جسے خود پر اعتماد تھا: وہ میری طرف دیکھ کر اسی طرح مسکرائے جیسے ہمیشہ مسکراتے تھے۔ گھر سے رخصت ہوتے ہوئے انھوں نے وہ ساری پیاری اور حوصلہ بڑھانے والی باتیں کہیں جو وہ، باپ کے طور پر، ہمیشہ کہتے تھے۔

ہمیشہ کی طرح میں ان کے مسرور، خوش باش اور اوسان بحال رکھنے والے مزاج پر رشک کرتا ہوا، انھیں جاتے دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ اُس دن میرے اندر خوشی کی ایک لہر بھی اٹھی جس نے مجھے شرمندہ سا کر دیا۔ یہ اس خیال سے اٹھی تھی کہ ممکن ہے میں ان کی طرح اتنا پُرسکون نہ رہا ہوں، ان کی طرح خوش باش یا پُراعتماد نہ رہا ہوں، لیکن میں نے اپنی زندگی لکھنے میں صرف کی ہے — آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے... میں اپنے ابا کے خلاف ایسی باتیں سوچنے پر شرمندہ ہو رہا تھا۔ کوئی اور نہیں بلکہ میرے ابا، جو کبھی میرے لیے تکلیف کا باعث نہیں بنے — جنھوں نے مجھے ہمیشہ آزاد رہنے دیا۔ ان سب باتوں سے ہمیں اس بات کی یاددہانی ہوتی ہے کہ تحریر اور ادب کا بہت گہرا تعلق ہماری زندگیوں کے مرکز میں کسی شے کی کمی سے، اور ہمارے خوشی اور شرمندگی کے احساسات سے ہے۔

لیکن میری کہانی کی تعمیر میں ایک ایسا توازن (symmetry) ہے جس نے اُس دن مجھے فوری طور پر ایک اور بات یاد دلا دی، اور مجھے اور بھی زیادہ شرمندگی میں مبتلا کر دیا۔ ابا کے اپنا سوٹ کیس میرے حوالے کرنے سے تیئیس سال پہلے، اور بائیس سال کی عمر میں میرے خود کو کمرے میں بند کر کے ناول لکھنے کے فیصلے کے چار سال بعد، میں نے اپنا پہلا ناول *Cevdet Bey and Sons* مکمل کیا؛ میں نے اس ناول کا، جو اس وقت تک غیر مطبوعہ تھا، ٹائپ کیا ہوا مسودہ کپکپاتے

ہاتھوں سے ابا کو دیا تا کہ وہ اس کو پڑھ کر اپنی رائے دیں۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ مجھے ان کے ذوق اور ذکاوت پر اعتماد تھا: ان کی تائید میرے نزدیک بہت اہم تھی کیونکہ انھوں نے، امی کے برعکس، میری ادیب بننے کی خواہش کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس وقت ابا ہمارے ساتھ نہیں بلکہ بہت دور تھے۔ میں نے بے تابی سے ان کے لوٹنے کا انتظار کیا۔ دو ہفتے بعد جب وہ واپس آئے تو میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ابا نے کچھ نہیں کہا، لیکن ایک دم مجھے یوں لپٹا لیا جس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ میری کتاب انھیں بہت پسند آئی ہے۔ کچھ دیر تک ہم اس بے چین کر دینے والی خاموشی میں گم رہے جو اکثر شدید جذباتی لمحوں کے ہمراہ ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد، جب ہم پُرسکون ہوے اور بات چیت کرنے لگے، تب ابا نے بہت پُرجوش اور مبالغہ آمیز زبان میں مجھ پر یا میری پہلی کتاب پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا: ان کی زبان سے نکلا کہ ایک دن مجھے وہ اعزاز ملے گا جسے نہایت مسرت کے ساتھ وصول کرنے کے لیے میں آج یہاں موجود ہوں۔

انھوں نے یہ لفظ اس لیے نہیں کہے تھے کہ وہ مجھے اپنی بات کا قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، یا اس اعزاز کو میرا ہدف بنانا چاہتے تھے؛ انھوں نے یہ لفظ اس انداز میں کہے تھے جیسے کوئی ترک باپ اپنے بیٹے کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے کہتا ہے کہ ایک دن تم پاشا ہو گے! برسوں بعد تک جب کبھی وہ مجھ سے ملتے تو اپنے انھی لفظوں سے میری حوصلہ افزائی کرتے۔

ابا نے دسمبر ۲۰۰۲ء میں وفات پائی۔

آج، جب میں یہ عظیم انعام — یہ عظیم اعزاز — عطا کرنے والی سویڈش اکیڈمی اور اس کے ممتاز ارکان کے سامنے، اور ان کے معزز مہمانوں کے سامنے کھڑا ہوں، میری دلی حسرت ہے کہ آج ابا ہمارے درمیان ہوتے۔

❋❋

BROUGHT TO YOU BY

عالمی کتابوں کے اردو تراجم PDF
فیس بک گروپ

www.facebook.com/groups/akkut